اَدبِ اسلامی: انسانی قلوب کوموہ لینے کا موثر ترین ذریعہ

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم

اَللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ایسی طبیعتیں دی ہیں جو حالات سے متاثر ہوتی ہیں، کسی اچھے عالم کو آدمی دیکھتا ہے تو اس کو اچھا دیکھ کر متاثر ہوتا ہے، اور اس کے جی میں آتا ہے کہ ہم بھی ایسا بننے کی کوشش کریں اور کسی برے آدمی کو دیکھتا ہے تو سوچتا ہے کہ ایسے ہم نہ بنیں، یہ انسانی طبیعت ہے کہ وہ اپنی عقل کو استعمال کرتا ہے، اچھے اور برے کا فرق کرتا ہے، اَللہ تعالیٰ نے ہمیں زبان عطا فرمائی ہے، اس میں بڑی خوبیاں رکھی ہیں، ہم اس کو سمجھتے ہیں کہ اپنی بات کو ادا کرنے کے لیے زبان اختیار کی جاتی ہے، یہ صحیح ہے لیکن کیفیات کو بھی زبان منتقل کرتی ہے، لفظ کے صرف معنیٰ ہی نہیں ہوتے، بلکہ ان میں کیفیت بھی ہوتی ہے، اسی طرح الفاظ کو جوڑ کر جو ایک عبارت بنتی ہے اس میں بھی تعبیر سے تغیر پیدا ہو جاتا ہے، کیفیت میں فرق آجاتا ہے، اب ایک شخص آرہا ہے، آپ اس سے کہو ''بھئی آؤ بیٹھو!'' اور ایک دوسرا شخص آتا ہے (کہتے ہیں) ''آیئے تشریف لایئے!''.....تو دونوں کی کیفیت میں فرق ہو گیا، دونوں ایک ہی معنیٰ رکھتے ہیں، ہم اِن کا بھی استقبال کر رہے ہیں، اُن کا بھی استقبال کر رہے ہیں، اِن کو بھی بٹھا رہے ہیں، اُن کو بھی بٹھا رہے ہیں، لیکن دونوں میں کیفیت کا فرق ہے، تو الفاظ میں کیفیتیں ہوتی ہیں اور وہ الفاظ بولنے والوں کو معلوم ہوتے ہیں اور ان کو فرق بھی معلوم ہوتا ہے اور اس سے وہ متاثر ہوتے ہیں۔

قرآن مجید میں انسان کی نفسیات کا لحاظ:

اَللہ تعالیٰ نے قرآن مجید نازل فرمایا بلیغ دلیل کے ساتھ، اَللہ تعالیٰ نے انسان کو مخاطب کیا ہے اور انسان کی نفسیات کا لحاظ کیا ہے۔ اِنسانی نفسیات جو ہیں، مثلاً ایک شخص بیٹھا ہوا ہے، کسی رنج کی حالت میں ہے، کوئی واقعہ ایسا پیش آیا، جس سے وہ رَنجیدہ ہے آپ اس سے جا کر خوشی کی بات کرنے لگے، کہے گا بھئی اس وقت ہمارے پاس وقت نہیں ہے، یا خوشی کی حالت میں ہے اور آپ آکر ایسی بات کرتے ہیں، جس سے وہ متفکر ہو جائے (کہے گا) کہ تو آپ نے ہم کو بہت اِیذا پہنچائی، تو مخاطب کی نفسیات کو سمجھ کر اگر بات کہی جائے تو بات کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے،

بعض وقت ایک جملہ انسان کی زندگی میں انقلاب لے آتا ہے، وہ معنی کے لحاظ سے نہیں لاتا، بلکہ اس کیفیت کے لحاظ سے لاتا ہے، جو کیفیت اس جملے میں ہوتی ہے اور وہ کیفیت کیسے پیدا ہوتی ہے؟ موقع محل کا لحاظ کرنے سے پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے، انسان کی نفسیات پیدا کیں، انسان کا مزاج بنایا، انسان کی طبیعت بنائی، آپ جانتے ہیں کہ طبیعتیں لوگوں کی ملتی جلتی بھی ہیں، ایک شخص ہے 'مایوسی' کی حالت میں رہتا ہے، ایک شخص 'توقع' کی حالت میں رہتا ہے، دونوں کی کیفیتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ ان سے جب آپ بات کریں گے، اگر ان کی کیفیت کا لحاظ کر کے ان سے بات کریں گے، تو آپ کی بات وہ توجہ سے سنے گا اور کہے گا آپ نے بہت فائدہ پہنچایا۔ اسپتالوں میں مریض داخل ہوتے ہیں، ان کا علاج ہوتا ہے، بے چارے سوچتے ہیں کہ ہم اچھے ہوں گے نہیں ہوں گے، دَوا ہم کھا رہے ہیں۔ جب اسلامی حکومت کے عروج کا زمانہ تھا، علم کے لحاظ سے، تعلیم کے لحاظ سے، عباسی حکومت کے زمانے میں شفاخانوں میں ایک انتظام یہ بھی تھا کہ کچھ لوگ ہوتے تھے جو شفاخانوں میں مریضوں سے ملتے تھے، کہتے تھے آھا آپ تو ماشاء اللہ بہت اچھے لگ رہے ہیں!..... آپ کی صحت بہتر ہے، کل ہم نے دیکھا تھا، کل کے مقابلے میں آپ بہتر ہیں، تو واقعی ان کا مرض آدھا ہو جاتا تھا، اگر مریض کو آپ تسلی تشفی کے ساتھ کہیں تو اس کا مرض آدھا دفع ہو جائے گا، لیکن صحت مند آدمی سے کہیے، تو ہوسکتا ہے بعض مرتبہ اس کا الٹا اثر پڑے، وہ سوچے گا یہ اپنی نظر لگا رہے ہیں، دونوں میں کتنا فرق ہے؟ ایک شخص غم زدہ ہو جائے گا کہ ہم پر نظر لگا رہے ہیں اور ایک شخص اس کا مرض آدھا ختم ہو جائے گا، تو یہ اَلفاظ کی کیفیات الفاظ کے استعمال کرنے کے مواقع سے اس کا بہت تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کا مزاج بنایا ہے، اس کی کیفیات بنائی ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسان کو مخاطب کیا تو اس کی نفسیات کی اس میں پوری رعایت کی ہے۔ قرآن مجید میں آپ دیکھیں مخاطب کس کو کیا ہے؟ منافقین کو مخاطب کیا، کفار مکہ کو مخاطب کیا، مدینہ کے یہودیوں کو مخاطب کیا، عیسائیوں کو مخاطب کیا، اَنصار کو مخاطب کیا، مہاجرین کو مخاطب کیا اور سب کے لحاظ سے مخاطب کیا، ایسا کہ بس!..... قرآن مجید کو پڑھ کر اسی وقت آدمی بے چین ہو جاتا تھا اور اس میں تبدیلی آجاتی تھی، کیوں؟ اس لیے کہ یہ بات سیدھے اس کے دل پر جا کر چوٹ کرتی تھی، اللہ تعالیٰ اس طرح بات فرمایا کرتے ہیں کہ اس کے دل میں بات اُتر جائے اور جب بات دل میں اُتر جائے تو آدمی کی عقل بھی اس کو روک نہیں پاتی، اگر آپ کو ایک چیز اچھی لگ جائے، پھر آپ کو کوئی سمجھائے تو بات سمجھ میں نہیں آئے گی کیونکہ دل میں اُتر گئی بات تو زیادہ سمجھانے سے آدمی مطمئن نہیں ہوگا۔ تو قرآن مجید نے کمال دکھا دیا ہے کہ مخاطبین کے دل کے اندر اتار دینے والی باتیں کہی ہیں، مثلاً:.....

''ریح'' اور ''ریاح'' میں فرق:

''رِیح'' ہوا کو کہتے ہیں، جمع اس کی ''رِیاح'' آتی ہے، قرآن مجید میں آپ دیکھیے ''ریاح'' کا جہاں استعمال ہے،

وہاں وہ ہوا مراد ہے جو بارش لاتی ہے، جو ٹھنڈک لاتی ہے اور جہاں ''ریح'' کا استعمال اللہ تعالیٰ نے کیا ہے، وہاں وہ عذاب والی ہوا مراد ہے۔ ریح طوفان والی ہوا کے لیے ہے، اتنی رعایت قرآن مجید نے کی ہے۔

''علی'' اور ''عالی'' میں فرق:

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے وہ بلندی جو نامناسب ہے، یعنی غرور والی، اس کے لیے ''عُلُوّ'' کا لفظ استعمال کیا اور وہ جو اچھی ہے اپنے لیے ''عَلِیُ'' کا لفظ استعمال کیا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے ''اَلْعَلِیُّ الْکَبِیْر'' کہا ہے اور فرعون کے لیے ''عَالی'' کا لفظ استعمال کیا ہے، ''کان عالیاً''۔ حالانکہ ''عالی'' اور ''علی'' کے معنیٰ ایک ہی ہیں، لیکن قرآن مجید نے اس میں فرق کیا ہے، کہ برے آدمی کو جو اپنی بلندی سے دوسروں کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے، اس کے لیے ''عالی'' کا لفظ استعمال کیا ہے اور وہ جو واقعی برتر اور عمدہ ہے اس کے لیے ''عَلِیّ'' کا لفظ استعمال کیا ہے، یعنی قرآن مجید نے مخاطب کی ذہنیت اور اس کی کیفیت کی رعایت کی ہے، اسی لیے قرآن مجید کا حال یہ تھا، یہ کہا جاسکتا ہے کہ آدھے صحابہ قرآن کو دیکھ کر مسلمان ہوئے اور آدھے (صحابہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ کے کردار کو دیکھ کر متاثر ہوئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ بھی ایسی ہی تھی، اس لیے کہا تھا (حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے) کہ ''کان خلقه القرآن'' کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت جاننا چاہتے ہو تو قرآن مجید پڑھو، اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ صلاحیت رکھی تھی کہ وہ موقع محل کے ساتھ بات کرتے تھے، اور اثر ڈالنے والی بات کہتے تھے، اسی لیے آپ سے جو ملتا تھا، وہ مسلمان ہونے پر مجبور ہو جاتا تھا، یعنی بے قابو ہو جاتا تھا۔

مفکر اسلام اور نظریۂ ادب:

تو اصل میں اللہ تعالیٰ نے زبان کے اندر یہ صلاحیتیں رکھی ہیں، جو کیفیتیں رکھی ہیں، ہم ان کیفیتوں کو اچھے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں، ہم چوں کہ ادب کو سمجھتے ہیں کہ جن لوگوں نے ادب کو خراب کر دیا، ادب انہی کی چیز ہے اور ادب سے ہم گریز کرتے ہیں کہ یہ برے لوگوں کی چیز ہے، ایسا نہیں ہے، برے لوگوں نے قبضہ کر لیا ہے، تو آپ اس قبضے کو دور کیوں نہیں کرتے؟ دور کیجیے! تو حضرت مولانا (ابوالحسن علی ندوی) نے یہ نظریہ قائم کیا، اس وقت صورت حال یہ تھی کہ جو لٹریچر آرہا تھا وہ الحاد پیدا کر رہا تھا، وہ غیر اسلامی ذہن بنا رہا تھا، بچوں کا بھی اور بڑوں کا بھی، مولانا کو اس کا بڑا تاثر ہوا، مولانا نے تاریخ سے وہ لٹریچر جمع کیا جو اچھا تاثر پیدا کرتا ہے، اور انسان کو اچھی راہ پر لگاتا ہے، ''مختارات'' کے نام سے وہ کتاب شایع ہوئی، پھر مولانا نے بچوں کے لیے وہ ادب اختیار کیا، اس لیے کہ عربی پڑھانا شروع کی تو عربی میں بچوں کو پڑھانے کے لیے ایسے لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں نہیں تھیں، کہ جن میں اسلامی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر بات کہی گئی ہو، مصر کا

لٹریچر داخل کرلیا گیا تھا، حکایات الاطفال، القراءۃ الرشیدہ.....تو اس میں صحیح تربیت نہیں ہوسکتی تھی۔

مصر العزیزۃ لی وطن وھی الفریدۃ فی الزمن

وھی الحمی وھی السکن وجمیع مافیھا حسن

یہ اشعار تھے، کہ مصر جو ہے اس سے اچھا کوئی ملک نہیں، مصر ایسا اور مصر ایسا، ٹھیک ہے مصر اچھا ہے، لیکن وہ سب سے اچھا تھوڑی ہے، بلادِ عربیہ سے اور مکہ مکرمہ سے اچھا تھوڑی ہے، لیکن وہ وَطَنیت کا جو بت وضع کیا جارہا تھا..... یورپ والوں نے لوگوں کو وطنیت کا گرویدہ بنادیا تھا، وطنیت کے نام سے الحاد آرہا تھا، تو ہمارے پاس ایسا کوئی لٹریچر نہیں تھا، مولانا نے اسی لیے یہ لٹریچر تیار کیا، پھر اس کو دَعوت بنادیا۔

اَدبِ اسلامی کا صحیح مفہوم:

ادب اسلامی کا بعض لوگوں نے مفہوم یہ سمجھا تھا کہ وعظ ونصیحت والا ادب!.....وَعظ ونصیحت بھی ادب میں آتا ہے، لیکن ادب پوری زندگی پر محیط ہے، انسان کے جو تاثرات ہیں، زندگی کے مختلف پہلوؤں میں تاثرات ہیں، غمی کے موقع پر، خوشی کے موقع پر اور نفرت کے موقع پر، محبت کے موقع پر، جتنی کیفیات انسان کو لاحق ہوتی ہیں، اگر ان کا لحاظ کر کے آپ بات کریں، تو آپ کی بات کا اثر پڑے گا، اور اس کا لحاظ اگر نہ کریں گے تو آپ کی بات الٹی ہوگی، بہر حال یہ ایک دعوت ہے اور اس میں ضرورت اس بات کی ہے کہ صرف زبان دانی کافی نہیں ہے، بل کہ ہمیں زبان کی اَچھائی کی طرف توجہ کرنی چاہیے، ہم ایسی زبان سیکھیں، ایسی زبان کی مشق ہمیں حاصل ہو کہ ہم موقع محل کے لحاظ سے جو بات کہیں اس کا اثر پڑے اور وہ نظریہ سامنے آئے جو نظریہ اس سے ہٹ کر ہے۔ ان شاء اللہ، یہ بات آہستہ آہستہ پیدا ہوگی اور ادب جو لوگوں کو خراب کر رہا تھا، اِن شاء اللہ وہی ادب اگر آج استعمال کریں گے، صحیح مقصد سے صحیح طریقے سے تو وہ لوگوں کو راحت پہنچائے گا، لوگوں کو صحیح راستہ پر لائے گا۔

صحتِ اعراب ومخارج کی اہمیت

''عربی عبارت صحیح پڑھنا بہت ضروری ہے، اس سے نہ صرف یہ پتا چلتا ہے کہ عبارت صحیح ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ (پڑھنے والا) کتنا سمجھا ہے؟ سمجھ کر پڑھ رہا ہے یا بے سمجھے؟! عربی زبان اس معاملے میں بڑی غیور ہے، وہ زیر وزبر کی غلطی بالکل برداشت نہیں کرتی، مرفوع پڑھنے کی جگہ آپ نے منصوب پڑھ دیا تو بس ساری تقریر پر پانی پھر گیا، اسی طرح مخارج کا بھی لحاظ ہونا چاہیے۔ ث، س، ص سب قریب قریب ہیں، مگر ''س'' کی جگہ ''ث'' یا ''ص'' کی جگہ ''ص'' پڑھ دیا تو عرب اس کو برداشت نہیں کریں گے، اگر بات سنیں گے بھی تو ناگواری کے ساتھ۔''

(حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی طلبہ سے گفتگو)